ڈاکٹر سید امجد حسین کے خاکوں میں ناسٹلجیائی عناصر

نیلم تاج، پی ایچ ڈی سکالر ہزارہ یونی ورسٹی مانسہرہ
ڈاکٹر نذر عابد، ایکس چیئر مین ہزارہ یونی ورسٹی مانسہرہ
ڈاکٹر محمد الطاف، چیئر مین شعبہ اردو ہزارہ یونی ورسٹی

Abstract:

Nostalgia is a beautiful feeling of our past with a little bit of sadness. Listening to an old song, seeing an old picture or meeting an old friend creates a strange feelings in our heart. It creates a sadness with a strong wish that old time would come back again but we know that time cannot come back. That is why we get sad. This condition is called nostalgia. A piece of art cannot become a great piece of art unless it has the ability to shake the senses. Dr. Syed Amjad Hussain is such an artist who always shares his memories which create the elements of nostalgia in his creative works. In this article, the authors have analyzed such nostalgic attitudes found in the various sketches written by Dr. Syed Amjad Hussain.

Key words: Nostalgia, Memories, Peshawar, Dr. Syed Amjad Hussain, feelings, Past

کلیدی الفاظ: ناسٹلجیا، پشاور، یادیں، ڈاکٹر سید امجد حسین، احساسات، ماضی

سورۃ یوسف کی تفاسیر میں ملتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹے حضرت یوسفؑ کی جدائی اور یاد میں اتنا روئے تھے کی ان کی آنکھوں کی بینائی ختم ہو گئی تھی۔ اسی طرح حضرت یوسفؑ بھی مصر میں اپنے وطن اور والد کی یاد اور شفقت میں بے چین رہتے تھے۔ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ نے جب مکہ سے مدینے ہجرت کی تو مدینہ میں مکہ کو شدت سے یاد کرتے تھے۔ غور کیا جائے تو یہ ناسٹیلجیا کی مختلف صورتیں تھیں۔ تاہم اس اصطلاح کو سب سے پہلے ایک فرانسیسی نفسیات دان جونسس ہوفر نے ۱۶۸۸ اپنی کتاب Medical Dissertation on nostalgia میں پیش کیا۔(۱) یہ اصطلاح ان لوگوں کے لیے استعمال کی گئی تھی جو حالت مسافرت میں تھے اور سخت ناامیدی اور اداسی میں مبتلا تھے۔ ۱۶۸۸ء کو یہ ایک نفسیاتی بیماری کے طور پر سامنے آئی جن میں ۸۵ فیصد سپاہی جو حالت جنگ میں تھے اور اپنے گھر جانے اور

اپنے پیاروں سے ملنے کی امید کھو چکے تھے۔ لیکن جدید تحقیق کے مطابق یہ بیماری نہیں بلکہ ایک صحت مندانہ رجحان ہے جو انسان کی توانائی کو مثبت انداز میں صرف کرتا ہے اور مستقبل کی راہوں کو روشن کرتا ہے۔

بہتر مستقبل کی تلاش میں یورپ کی طرف ہجرت کرنے والوں کی دنیائیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ ایک نئی دنیا کے حسن سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کی مسرتوں کے ساتھ ساتھ کھوئی ہوئی کچھ شاموں کی دھنک اور مسلسل یاد آتی ہوئی صبحوں کی افسردہ چمک سے نظریں چرانا ان کے لیے آسان نہیں ہوتا۔ نقل مکانی کے صبر آزما لمحوں سے گزرنے والوں کا پہلا مسئلہ اُن کا اپنا وطن اور گھر بار ہوتا ہے۔ اس جذباتی اور زمینی رشتے کو تسلیم کیے بغیر نئے ماحول میں کبھی آزادی سے سکون کا سانس نہیں لیا جاسکتا۔ نئے ماحول، نئے ملک اور نئی ثقافت کے سائے تلے کچھ بھی کر لیں لیکن ایک احساس بہرحال دامن گیر رہتا ہے کہ:

یوں تو دیارِ غیر میں کیا ہو نہیں سکتا
مٹی کا قرض پھر بھی ادا ہو نہیں سکتا

انسان کہیں بھی رہے لیکن اپنے ماضی سے کٹ کر اس کا کوئی حال اور مستقبل نہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر انسان کے ماضی کا پہلا ورق، اس کے وطن کی مٹی کی خوشبو میں بسا ہوتا ہے اور ادیب اس خوشبو کی سچائی سے انکار نہیں کرسکتا۔ دیارِ غیر میں زندگی بسر کرنے والے اردو کے ادیب نئی سرزمینوں سے مکمل وابستگی کے باوجود اس پہلی سچائی کے بھی امین اور محافظ ہیں۔

تارکین وطن قلم کاروں کی ایک بڑی تعداد یورپ کے سبزہ زاروں میں اپنی زندگی کی شامیں بسر کر رہے ہیں ۔وطن سے دور جا بسنے والے ادیب چاہے وہ شمالی امریکہ میں ہوں، یورپ میں ہوں، مشرقِ وسطیٰ میں ہوں یا کسی اور علاقے میں، ان سب کے دلوں کی کیفیت یوں بیان کی جاسکتی ہے۔

اٹھ کر تو آگئے ہیں تری بزم سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

یہیں سے وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ جسے اکثر و بیشتر بہت سے اربابِ دانش، بے گھری یا وطن بدری کا ناسٹلجیا کہہ کر سرسری گزر جاتے ہیں۔ ناسٹلجیا ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے اور اس کے اظہار میں کوئی قباحت نہیں۔ کیونکہ ماضی کو یاد کرنا اور اس میں کھوئے رہنا ایک فطری عمل ہے اس سے انسان خود کو جدا نہیں کر سکتا۔ جدید تحقیق کے مطابق ماہرین نفسیات ناسٹلجیا کے حوالے سے کہتے ہیں:

> ’’جب انسان حال کی بحرانی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے تو اس اضطرابی کیفیت میں وہ خوشگوار یادوں میں پناہ لیتا ہے۔ یا پھر ایسے مستقبل کے خوابوں کے تانے بانے بنتا ہے جس کا وقت موجود کا تلخ حقیقتوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔،،(۲)

زندگی میں اپنے ماضی کو فراموش کرنا زندگی کو فراموش کرنا ہے۔ ماضی سے وابستہ شیریں یادیں انسان کے حال کا دامن خوشیوں سے بھر کر آگے بڑھنے میں مدد دیتی ہیں۔ ڈاکٹر سید امجد حسین اس حوالے سے اپنی کتاب "یک شہر آرزو" میں لکھتے ہیں:

> ’’میرے حال کا دامن تلخیوں سے نہیں ماضی کے شیریں اور خوبصورت یادوں سے بھرا ہوا ہے۔ یہی یادیں جہاں ایک جانب میرے حال کی پریشانیوں کا مداوا ہیں تو دوسری طرف میرے مستقبل کی راہیں استوار کرنے میں مدد۔ اگر کمی ہے تو صرف اس بات کی کہ میرا دامن اتنا وسیع نہیں کہ ماضی کی شیریں یادوں کے سارے پھول سمیٹ سکے۔،،(۳)

ڈاکٹر سید امجد حسین کی زندگی کا اساسی حوالہ اپنی مٹی، اپنے شہر، اپنے ملک، اپنی ثقافت اور اپنے لوگوں سے محبت بلکہ عشق ہے۔ وہ رہتے تو امریکہ میں ہیں لیکن اُن کی صبحیں اور شامیں پشاور کی یادوں میں گزر جاتی ہیں۔ امریکہ سے پشاور کا سفر وہ چند لمحوں میں طے کر لیتے ہیں اور مختلف اوقات میں پشاور شہر کی سرگرمیاں ان کی تحریروں میں ایک فلم کے سین کی طرح آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہیں۔ ڈاکٹر سید امجد حسین اپنی اس کیفیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

’’میں فیض کی طرح جیل کی چار دیواری میں تو محبوس نہیں لیکن میرے لیے وطن کی جدائی کچھ ایسی ہی جذباتی اور نفسیاتی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ بیشتر تارک الوطن ایک مختصر عرصے کے بعد وطن کے ساتھ وہ تعلق محسوس نہیں کرتے جو فراق کے ابتدائی دنوں میں جزولا ینفک ہوتا ہے۔ میرے دل میں وہ کسک اور طلب آج بھی اسی طرح موجود ہے جیسے ۱۰ اگست ۱۹۶۳ء کو تھی جب میں پشاور کو خیر باد کہہ رہا تھا۔ امریکہ نے مجھے بہت کچھ دیا لیکن میری اس تھوڑی بہت دنیاوی کامیابیوں میں میری اپنی محنت کم اور وطن کے دیئے ہوئے توشے کا زیادہ دخل ہے۔،،(۴)

ڈاکٹر سید امجد حسین کا بچپن اور جوانی پشاور کے گلی محلوں اور وہاں کے مکینوں کے ساتھ گزرا اور ان کے ساتھ ڈاکٹر سید امجد حسین کی بے شمار یادیں وابستہ ہیں۔ انسان کے بیتے ہوئے لمحے خواب کی صورت میں اُس کے دل اور آنکھوں میں زندہ رہتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ وقت اچھا گزرا ہو۔ لیکن اگر ایسا نہ بھی ہو تو انسانی حافظہ صرف ان لمحوں کو محفوظ کرتا ہے جن میں انسان ہمیشہ رہنے کی تمنا میں تڑپتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر سید امجد حسین کی پشاور سے محبت اور ناسٹلجیا کے بارے میں مشرف مبشر اپنے ایک مضمون میں لکھتی ہیں:

’’ڈاکٹر سید امجد حسین کی اساس اور پہچان اپنی مٹی سے جڑا رہنا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ بچے مٹی سے اور مٹی میں کھیل کر بڑے ہوتے تھے۔ شاید اسی لیے وہ زندگی کے آخری لمحوں تک اسی مٹی سے جڑے رہتے تھے۔ ڈاکٹر سید امجد حسین اسی قبیلے کے پُتر رہے ہیں جبھی تو وہ اپنی جائے پیدائش، اپنے مسکن، اپنے شہر اور اس کے گلی محلوں سے اتنی گہرائی اور پختگی کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سید صاحب امریکہ میں بیٹھ کر بھی پشاور کے گلی محلوں اور لوگوں کو یاد کرتے ہیں۔،،(۵)

ڈاکٹر سید امجد حسین ماضی کی یادوں کو سرمایہ حیات سمجھتے ہیں۔ انھیں ماضی ہی سے زیست کا مزہ ملتا ہے۔ ڈاکٹر سید امجد حسین کی زندگی کے دامن میں جن خوشگوار یادوں کے پھول اور کانٹے ہیں وہ ان کے ہاں خیابان کا لطف پیدا کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر سید امجد حسین نے امریکہ میں اپنے گھر کے گوشے کو پشاوری ثقافت کا نمونہ بنا رکھا ہے۔ پشاوری ماحول کی طرح گاؤ تکیے، چارپائیاں، پشاوری ثقافت سے تعلق رکھنے والی اشیاء غرض وہاں داخل ہوتے ہی بیگانگی کا احساس غائب ہو جاتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اپنے شہر پشاور میں قدم رکھ دیا ہو۔ ڈاکٹر سید امجد حسین اس حوالے سے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> ''جب میں خیبر میڈیکل کالج کے دوسرے سال میں تھا تو میں نے کالج کے سالانہ آرٹ مقابلے میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔۔۔ مجھے ماڈل بنانے کی تھوڑی سوجھ بوجھ تو تھی۔۔۔۔ ماڈل کو پہلا انعام ملا۔۔۔۔ میرا پورا ارادہ تھا کہ عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد میں اپنے لیے اسی ماڈل کی طرز کا بنگلہ بناؤں گا ۔وہ خواہش پوری نہ ہو سکی لیکن وہ ننھا منا بنگلہ میرے ذہن میں ہمیشہ کے لیے یادیں چھوڑ گیا۔۔۔ بہر حال میں اپنے حال میں خوش ہوں اور جس گھر میں میری رہائش ہے وہاں بھی میں نے کچھ نہ کچھ اضافہ کر کے حجرا بنایا ہے جس میں چارپائیاں ڈالی ہیں جو مجھے پشاور کے گھر کا احساس دیتی ہیں۔'' (۶)

ڈاکٹر سید امجد حسین کے خاکوں پر مشتمل کتابیں ان کے روح کی گہرائی میں بسی محبت، چاہت اور احساسات و جذبات کی شدت کے مظاہر ہیں۔ ایک کھرا اور سچا انسان ہی اپنے ماضی کے ساتھ کلی طور پر وابستہ رہ سکتا ہے۔ چند لوگ پوری وابستگی اور شدت سے ماضی کی ہر کیفیت سے متعلق رہتے ہیں۔ ڈاکٹر سید امجد حسین اپنے خاکوں میں دوست احباب، رشتہ داروں کے لیے ہی انسیت کا اظہار نہیں کرتے بلکہ وہ پشاوری معاشرے میں رہنے والے ہر خاص و عام، پیشہ وروں، ہنر مندوں، کلرکوں، اساتذہ غرض زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے لوگ ان کے منظور نظر ہیں اور ڈاکٹر سید امجد حسین کی نظر میں ان لوگوں کی بڑی وقعت ہے۔ ڈاکٹر سید امجد حسین کے دل و دماغ اور یادداشت پر پرانے نقوش ایسے

انمٹ ہیں کہ گلی محلے کے ساتھی اور محلے دار بھی بھلائے نہ جا سکے۔ اپنے ایک خاکے میں ڈاکٹر سید امجد حسین اپنے چند خاص دوستوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ارشاد، جوہر میر، عتیق صدیقی اور میں سال میں ایک دفعہ کہیں نہ کہیں اکھٹے رہتے ہیں۔ یہ چار درویشوں کی ٹولی میر امن دہلوی کے درویشوں سے مختلف ہے۔ ہم دو تین دن کے لیے اکھٹے ہوتے ہیں اور پشاور کو محور بنا کر دل پشوری کرتے ہیں۔ بقول ارشاد اس دوران ہماری زبان تالو سے نہیں لگتی ۔۔۔۔ ہم پشاور اور پشاوری دوستوں کو یاد کرتے ہیں۔"(۷)

ڈاکٹر سید امجد حسین کے خاکے پشاور شہر کی تہذیب و تمدن، دوست احباب اور گلی محلے کی یادوں سے معمور ہیں۔ ان خاکوں سے جہاں پشاور کے رسم ورواج، اور تہذیب وتمدن کی بو باس رچی بسی ہوئی ہے وہاں ڈاکٹر سید امجد حسین کی ادبی شخصیت بھی نکھر کر قاری کے سامنے آجاتی ہے۔

عام طور پر دیکھا جائے تو بچپن کا زمانہ انسان کی زندگی کا ایک یادگار اور دلچسپ زمانہ ہوتا ہے جو بھلائے نہیں بھولتا۔ بچپن کی کھٹی میٹھی یادیں اکثر اوقات حال کی تلخیوں اور کثافتوں سے دور انسان کو ایک ایسی دنیا میں پہنچا دیتی ہیں جہاں تفکرات میں گھرا ذہن راحت، سکون اور آسودگی محسوس کرتا ہے۔ بچپن کی شرارتیں، معصومیت،، اٹھکیلیاں اور بے فکری دل و دماغ کو خوشی سے بھر دیتی ہے۔ بچپن چاہے مفلسی و تنگ دستی میں گزرا ہو لیکن اس کی خوبصورت یادیں ان محرومیوں پر غالب آکر دل و دماغ کو فرحت کا احساس عطا کرتی ہیں۔ ڈاکٹر سید امجد حسین ماسٹر محمد علی کے خاکے میں اپنے پرائمری سکول سے وابستہ خوبصورت اور دل نواز یادوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مچھی ہٹہ پرائمری سکول کے باہر گلیوں کی بھول بھلیوں میں شاہ نور پیر کا مزار تھا غالباً انہی بزرگ نے ہمارے علاقے کی بنیاد رکھی تھی، ایک بار جب محمد علی کے مظالم بہت زیادہ ہو گئے تو کلاس کے بہت سے لڑکے شاہ صاحب کے مزار پر منت مانگنے گئے ہم نے نہایت خشوع اور خضوع کے ساتھ دعا مانگی کہ اگر ماسٹر محمد علی مر جائے تو ہم مزار پر چڑھاوا دیں گے فیصلہ یہ ہوا کہ

ہم اپنا جیب خرچ جمع کر کے مزار پر نیاز دیں گے۔ ہمارے بچپنے میں یہ عام رواج تھا اور اب بھی ہے کہ ضرورت مند کسی مزار پر جا کر منت مانگتے ہیں اور منت پوری ہو جانے کی صورت میں مزار پر چڑھاوا دیتے ہیں۔ پیروں اور ولیوں کی کرامتوں پر ہمارا یقین اس قدر مستحکم تھا کہ ہم نے سوچا کہ صرف دعا کرنے کی دیر تھی۔ اللہ میاں اور شاہ نور پیر آپس میں صلاح مشورہ کرنے کے بعد ضرور ماسٹر محمد علی کو ٹھکانے لگا دیں گے۔۔۔۔۔ ہر صبح اس توقع پر سکول آتے کہ کہ سکول میں پہنچتے ہی خبر ملے گی کہ پچھلی رات کو محمد علی مر گیا لیکن ہر صبح اس کی موت کی خبر سننے کے بجائے محمد علی سے ہی سامنا ہوتا رہا۔۔۔۔ محمد علی جابر اور ایک بے حس انسان ہے جس نے لاتعداد کمسن لڑکوں پر اتنا بڑا نفسیاتی تشدد کیا ہے کہ کئی ایک عمر بھر کے لیے نفسیاتی طور پر زخمی ہو گئے۔ اگر میں چاہوں بھی تو ایسے شخص کے ساتھ نہ تو علیک سلیک کر سکتا ہوں اور نہ ہی اسے معاف کر سکتا ہوں۔،،(۸)

ماضی کا سفر بہت مشکل مرحلہ ہے۔ مڑ کر دیکھنا اکثر پتھر کر دیتا ہے لیکن ڈاکٹر سید امجد حسین ان متروک گلیوں میں قاری کی انگلی پکڑ کر بہت سہل انداز میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ رشتوں سے گہری وابستگی، اندرونی کیفیات کا دلکش اظہاریہ، محبت و حسن اور شوق پل پل اپنا آپ منواتے نظر آتے ہیں۔ یہ گزرے ہوئے وقت کی دلکشی کی ایک خوبصورت کہانی ہے جو تمام انسانوں کے اندر کہیں نہ کہیں سانس لیتی اور اپنے ہونے کا احساس دلاتی رہتی ہے۔ یہ یادداشتیں نہ صرف ایک عہد اور ماحول کو محفوظ کرتی ہیں بلکہ بہت معلومات افزا بھی ہوتی ہیں۔ جن واقعات، مقامات، تمدنی اقدار، شخصیات اور اشیاء کا والہانہ اور مکرر ذکر ڈاکٹر سید امجد حسین کے خاکوں میں جا بجا پھیلا ہوا ہے وہ ان کے حافظے اور متخیلہ میں پرانی یادوں کی صورت ظہور کرتا ہے اور صفحہ قرطاس پر الفاظ کی صورت متشکل ہوتا ہے۔ یہ تمام عناصر ذہنی اور فنی سطح پر ان کے ہاں ناسٹلجیا میں بدل جاتے ہیں۔ مثلاً بچپن اور لڑکپن کی شرارتیں اور گلی محلے کی یادیں ان کے ہاں پشاوری ناسٹلجیا کو تشکیل دیتے ہیں۔ ڈاکٹر سید امجد حسین کے زیارت پر منت مانگنے کے بارے میں ڈاکٹر ظہور احمد اعوان لکھتے ہیں:

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے صرف ماسٹر محمد علی کے ذکر میں ڈاکٹر سید امجد حسین کا ذہن ایک دوسری انتہا کی طرف گیا ہے اس شخص کو امجد نے آخری دم تک معاف نہیں کیا جس ماسٹر کے مرنے کی دعائیں ننھے امجد نے رو رو کر مچھی ہٹہ کی کسی زیارت میں مانگی تھیں وہ ماسٹر جب امجد کے ہسپتال کے وارڈ میں بواسیر کے زخموں کی وجہ سے بستر پر کراہتا نظر آتا ہے تو امجد کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے اس کے باوجود وہ کسی قسم کا انتقام لینے کی جگہ وارڈ کسی دوسرے ڈاکٹر پر چھوڑ کر چھٹی کر جاتا ہے۔،،(۹)

اس قسم کے خاکوں میں ڈاکٹر سید امجد حسین نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ استادوں کے ہاتھوں لگے ہوئے زخم شاگردوں کے دلوں سے کبھی مندمل نہیں ہوتے اور نہ ہی ہر استاد سے کوئی شاگرد مثبت چیز سیکھتا ہے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ اس طرح زیارتوں پر جا کر منت مانگنا ایک غلط عقیدہ ہے۔

انسان کی فطرت میں شامل ہے کہ وقت چاہے اچھا گزرا ہو یا برا اسے اپنے ذہن سے نہیں مٹایا جاسکتا۔ انسان اپنی زندگی میں مختلف مقامات بچپن، لڑکپن، جوانی اور بڑھاپا سے گزرتا ہے لیکن ان تمام مراحل میں زمانہ طالب علمی کے واقعات ناقابلِ فراموش واقعات ہوتے ہیں۔ سکول و کالج سے جڑی یادیں عمر بھر کے لیے انسان کے دل و دماغ پر نقش ہو جاتی ہے اور وقتاً فوقتاً انسان کے دل و دماغ کو معطر کرتی رہتی ہیں۔ ڈاکٹر سید امجد حسین حافظ جی کے خاکے میں اپنے پرائمری سکول سے وابستہ یادوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

'' غالباً ۱۹۵۴ء کا ذکر ہے جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ میں دوسری جماعت میں تھا حکومت نے فیصلہ کیا کہ جیتنے کی خوشی میں اسکولوں میں مٹھائی تقسیم کی جائے۔ ہم سب قطار میں کھڑے ہو گئے اور استادوں نے ہر لڑکے کو چھوٹی لال مٹھائی کا خاکی لفافہ دیا۔ لفافہ کیا تھا دنیا جہاں کی نعمت تھی جو ہمارے ہاتھوں میں تھمادی گئی تھی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار خوب سیر ہو کر مٹھائی کھائی۔ اب سوچتا ہوں تو منہ میں اس مٹھائی کا ذائقہ لوٹ آتا

ہے، بہت جی کرتا ہے کہ وصیت کر جاؤں کہ میرے مرنے کے بعد بھی مجھی ہٹہ سکول کے بچوں کو پیٹ بھر کر مٹھائی کھلائی جائے۔،،(۱۰)

ڈاکٹر سید امجد حسین کے خاکوں پر مشتمل کتاب "چتراں والا کٹورا" کے عنوان پر غور کیا جائے تو چتراں والا کٹورا بذات خود ڈاکٹر سید امجد حسین کی زمانی و مکانی ناسٹلجیا کی نمائندہ ترکیب ہے جس میں ایک خاص طرز کے منقش کٹورے کے ساتھ ان کی یادوں کی وابستگی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ یادیں ایک تو ان کے بچپن سے وابستہ ہیں اور دوسرے اپنی خاص طرز ثقافت سے بھی جڑی ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر سید امجد حسین اپنے غیر مشخص خاکے "چتراں والا کٹورا" میں ماضی کی خوبصورت ثقافتی مظہر گھڑونجی پر رکھے ہوئے گھڑے اور کٹورے کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

،،علی الصبح منقشی کٹورے میں اسپغول کا شربت پینا میرے معمولات میں شامل ہے۔ یہ منقشی کٹورا مجھے جام جہاں نما نظر آتا ہے جس میں ہر چسکی کے ساتھ چہروں اور یادوں کے منظر ٹھاٹھیں مارتے محسوس ہوتے ہیں۔ چاندی یا تانبے کا یہ منقش نقرئی کٹورا اپنے نقوش یا چتر کی criss-crassing سے زندگی پر محیط لگتا ہے، میرا بچپن ابھی تک اسی کٹورے کے محور پر میری زندگی کے مہ و سال ترتیب دے رہا ہے، مجھے یاد ہے اور گھروں کی طرح میرے گھر میں بھی گھڑونجی ہوتے تھی۔۔۔۔ یہ کٹورا اس ماحول اور اس ماضی کا بہت ہی اٹوٹ انگ تھا جس میں میری نشوونما ہوئی تھی، جس نے مجھے رینگنا اور چلنا سکھایا تھا پہلی چوٹ کا ادراک پہلی ندامت اور پہلی خوشی کا احساس دیا تھا۔ برسوں بعد جب ایک روز مجھے اپنی ہمشیرہ بیگو (ثریا بیگم سید منور شاہ جسے ہم پیار سے بیگو کہتے ہیں) کے گھر میں قلعی کیا ہوا نقرئی سا کٹورا نظر آیا تو میں نے جھٹ سے اٹھالیا جیسے میرا سارا بچپن اور لڑکپن اس کٹورے میں تیر رہا ہو، بیگو کہنے لگی"۔۔۔۔ میں نے کہا نہیں یہی پرانا کٹورا چاہیے مجھے،، چتراں والا، منقش کٹورا واقعی میرا جام جمشید ہے، غالب کا جام

سفال ٹوٹ سکتا تھا میرا کٹورا نہیں ٹوٹ سکتا، اس کے خوبصورت نقش و نگار میں مجھے ماضی کے دکھ سکھ، خوشیاں، غم، دوست دشمن اور اپنے پرائے دکھائی دیتے ہیں، جب چاہوں جسے چاہوں دیکھ سکتا ہوں۔،،(۱۱)

خلاصہ کلام یہ کہ ڈاکٹر سید امجد حسین کے ل خاکوں میں ان کے لیے یے صرف اشخاص ہی اہم نہیں بلکہ ہر وہ چیز اہم ہے جن سے اُن کی یادیں وابستہ ہیں اور یہ ماضی کا ایک خاص ثقافتی تناظر بھی رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر سید امجد حسین نے خاکہ نویسی میں اعتدال اور توازن رکھنے کی بڑی کوشش کی ہے اور یہ شعوری کوشش نہیں بلکہ ان کے مزاج کی بھلمنساہٹ اور انصاف پسندی کا شاخسانہ ہے۔ وہ پھولوں اور کانٹوں کے ساتھ بیک وقت نباہ کرنا اچھی طرح جانتے ہیں اور دونوں کا ذکر ایک ہی جگہ پر بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر سید امجد حسین کے خاکے پڑھتے ہوئے قاری کو گہرا احساس ہوتا ہے کہ وہ پشاور سے وابستہ ہر شخص، ہر چیز اور ہر منظر کو ماضی کے تناظر میں جس طرح بھرپور جزئیات کے ساتھ پیش کرتے ہیں اس سے ان کے اس داخلی اضطراب کا اظہار ہوتا ہے جو اُن کی تخلیقی شخصیت کا حصہ ہے۔ اپنے ہر خاکے میں ڈاکٹر سید امجد حسین پشاور سے وابستہ یادوں کو یوں مسلسل دوہراتے چلے جاتے ہیں کہ اُن کی تحریریں پشاوری ناسٹلجیائی کیفیات کا ایک ایسا منظر نامہ ترتیب دینے میں کامیاب ٹھہرتی ہیں کہ قاری خود کو بھی اس منظر نامے کا ایک حصہ بنتا محسوس کرنے لگتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ https:en.m.wikipedia.org

۲۔ مبادیاتِ نفسیات، کرامت حسین جعفری، ایجوکیشنل پبلشرز اُردو بازار، لاہور ۱۹۶۷ء، ص ۲۱۷

۳۔ ڈاکٹر سید امجد حسین، یک شہر آرزو، بشیر آرٹ پریس، پشاور، ۱۹۹۵ء، ص ۱۳

۴۔ ایضاً، ص ۱۴

۵۔ مشرف مبشر، "ہسدے وسدے لوگ تجزیاتی مطالعہ " مشمولہ ادب لطیف، لاہور، جولائی ۲۰۲۳ء، ص ۲۱

۶۔ ڈاکٹر سید امجد حسین، ہسدے وسدے لوگ، لٹریری سرکل آف ٹولیڈو، امریکہ، ۲۰۲۱ ص ۲۵

۷۔ ڈاکٹر سید امجد حسین، چتراں والا کٹورا، بشیر آرٹ پریس، پشاور، ۲۰۰۳ ص ۱۳

۸۔ڈاکٹر سید امجد حسین، در مکتب، لٹریری سر کل آف ٹولیڈو امریکہ، ۲۰۰۵ ص ۱۷

۹۔ ایضاً، ص ۷۴

۱۰۔ ایضاً، ۳۷

۱۱۔ڈاکٹر سید امجد حسین، چتر اں والا کٹورا، ص ۵